بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

نظرات

یوں تو دنیا کے ہر ملک میں آباد مسلمانوں کو اپنے اپنے حالات کے مطابق طرح طرح کے مسائل سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور سیلاب کے دھارے کی طرح اُن کے ہاں جو نت نئی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اِن کی وجہ سے اُن کی وہ طمانیتِ قلب، آسودہ خاطری اور خود اعتمادی بتدریج رخصت ہو رہی ہے، جس پر کہ وہ صدیوں سے نازاں تھے، اور جو ہر مشکل اور مصیبت میں اُن کے لئے ڈھال کا کام دیا کرتی تھی، لیکن وہ ملک جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اُن کا سیاسی اقتدار اور نظم و نسقِ حکومت خود اُن کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کو اس ضمن میں اور بھی زیادہ سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ مجبور ہیں کہ خود اپنی ذمہ داری اور اپنی صوابدید پر بڑے اہم فیصلے کریں۔ شاید ہی تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کو کبھی اتنے بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ یہ چیلنج محض سیاسی و معاشی و تہذیبی نہیں، بلکہ ذہنی و فکری اور اذعان و یقین کا بھی ہے۔ پھر اس کی گہرائی اور وسعت کی کوئی حد نہیں۔ اور اس کی شدّت کا تو پوچھنا ہی کیا۔

مسلمان ملکوں میں سب سے پہلے ترکی کو ان مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں وہاں "تنظیمات" کے نام سے ایک تحریک شروع ہوئی۔ جس کے پیش نظر اسلامیت، عثمانیت (ترکی کی دولتِ عثمانیہ کی رعایت سے)، اور یورپیت (خاص طور سے اس کی لبرلزم اور نمائندہ اور پارلیمانی حکومت کا نظام)، کی اعلیٰ قدروں کو باہم سمو کر ایک مرکب بنانا تھا۔ یہ تجربہ ناکام رہا۔ اور سلطان عبدالحمید دوئم نے

پان اسلامزم کا لبادہ پہن کر پورے ۳۲ سال ۱۹۰۸ء تک ایک جابر و مستبد فرمان روا کی طرح حکومت کی۔ اسی کا ردّ عمل اتاترک تھے جن کی نافذ کردہ اصلاحات اب تک ترکی کی زمین میں اچھی طرح جڑ نہیں پکڑ سکیں، اور ان میں اور ترکوں کی اسلامی روایات میں کش مکش جاری ہے۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر محمد مجیب حال ہی میں ترکی گئے تھے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

میں ازمیر (سمرنا) سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور ایک مقام پر گیا۔ اور وہاں کے نائب حاکم سے ملا۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا کہ ہم ترک مسلمان ہیں، اور سچے مسلمان ہیں، مگر ہم اپنی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یورپی سائنس اور صنعت حاصل کریں۔ اس لئے ہمارا رُخ یورپ کی طرف ہے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میری بیوی اسکول میں اُستانی ہیں۔ خود پنج وقتہ نماز پڑھتی ہیں۔ اور بچوں بچیوں میں دینی جذبہ بیدار کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کے بیڈ روم میں قرآن کی دو جلدیں تھیں۔ ایک عربی اور ایک لاطینی رسم خط میں اور غسل نماز کے وضو کا سامان تھا۔

پروفیسر مجیب کا یہ تاثر ہے کہ ترکی میں نئی اور پرانی وضع یعنی "مغربیت" اور "اسلام" کی کش مکش جاری ہے۔ اور جاری رہے گی۔ گو شہری آبادی اور دیہاتی آبادی کی ذہنیت میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اس کے باوجود دینی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ موصوف کا بیان ہے کہ جن مسجدوں میں میں گیا، لوگ نماز پڑھتے یا کلام پاک کی تلاوت کرتے ملے۔ نماز کے وقت مسجد کے اندر جگہ مشکل سے ملتی ہے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حکومت نے ستائیس ہزار اسکول بنوائے ہیں۔ کسانوں نے چندہ کر کے اکتالیس ہزار مسجدیں بنوالی ہیں۔

اور یاد رہے کہ ترکی کا نظام حکومت سیکولر ہے، اور یہ سیکولر نظام گزشتہ چالیس سال سے وہاں نافذ ہے۔

ترکی میں علماء بحیثیت ایک منظم جماعت کے قابلِ ذکر طاقت نہیں رہے۔ چنانچہ اب "مغربیت" کے خلاف اگر کوئی ردّ عمل ہوتا ہے۔ تو ترک جمہور کی طرف سے ہوتا ہے، اس لئے وہ بہت حد تک فطری ہے۔ لیکن ایران کی یہ حالت نہیں۔ اسی لئے کچھ عرصہ ہوا، وہاں کی حکومت کو علماء کی بعض جماعتوں کو سختی سے دبانا پڑا۔ کیوں کہ وہ معمولی معمولی اصلاحات تک کی مخالف تھیں اور ان کے خلاف شورش برپا کرنے پر تُل گئی تھیں۔ موجودہ شہنشاہ کے والد مرحوم رضا شاہ کو بھی اصلاحات نافذ کرنے میں علماء سے جو یعنی

پڑی تھی۔

مصر عربی دنیا کا علمی و فکری مرکز ہے۔ اُس کی ایک ہزار سال پرانی دینی درس گاہ جامعہ ازہر میں ہر ملک کے مسلمان طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قاہرہ اخبارات، رسائل اور کتابوں کا بہت بڑا اشاعتی مرکز ہے۔ اور اُس کی نشریات پوری عرب دنیا میں ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں۔

اب مصر اس "مغربیت" اور "اسلام" کی کش مکش کے مسئلے سے کس طرح عہدہ برآ ہو رہا ہے، وہ ہمارے لئے خاص طور سے قابلِ توجہ ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو جامعہ ازہر میں جو مصر کی دینی زندگی کا سرچشمہ اور "علماء" پیدا کرنے کا واحد ادارہ ہے، بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ جامعہ ازہر پہلے کی طرح صرف دینی درس گاہ نہیں رہی کہ اُس کے فارغ التحصیل دینی عالم کہلائیں، اور اُن کا کام صرف امامت، خطابت، وعظ و ارشاد اور دینی علوم کی تدریس ہو، اب ازہر میں دینی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم جیسے زراعت، سائنس، دانتوں اور حیوانات کے علاج سے متعلق ڈاکٹری بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور دوسری زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ازہر کا فارغ التحصیل عالمِ دین صرف دین کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنانے پر مجبور نہ ہو، بلکہ وہ دوسرے پیشوں میں بھی جاسکے اور اُن میں رہ کر دینی خدمت بھی کرے۔

روزنامہ الاہرام مورخہ ۴ جولائی ۱۹۶۶ء نے لکھا ہے کہ ازہر سے فارغ التحصیل ہونے والوں نے کوئی ۱۵ مقالات پیش کئے ہیں، جو زراعت اور دوسرے اُمور کے بارے میں ہیں۔ ان مقالات میں کامیاب ہونے کے بعد انہیں ازہر سے عالمیہ، ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی سندیں دی جائیں گی۔

جب علمائے دین کی پہلے کی طرح سب سے الگ ایک ممتاز جماعتی تنظیم نہیں رہے گی۔ تو لازماً اُن کا معاشرے میں وہ کردار بھی ختم ہو جائے گا، جس کی وجہ سے وہ ہر اصلاحی اقدام کے آڑے آتے اور بحیثیت ایک جماعت کے دین کے نام سے اس کی مخالفت پر تُل جاتے ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مصر میں اوقاف کا بڑا وسیع اور اچھا انتظام ہے۔ اور ہزار ہا ہزار علماء بحیثیت امام، خطیب اور واعظ و مرشد وزارتِ اوقاف سے منسلک ہیں۔ پھر جامعہ ازہر تو اپنی جگہ ایک مستقل ریاست ہے ہی، جس میں کہ کثیر التعداد علماء کام کرتے ہیں۔ غرض علماء کی "تحریج" بند نہیں کی گئی، البتہ انہیں دینی علوم کے ساتھ دوسرے ضروری اور عملی مضامین کی تعلیم دے کر معاشرے اور خود اسلام کے لئے

زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جامعہ ازہر کی وجہ سے مصر ہمیشہ سے علماء کا بہت بڑا گڑھ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے عرب ملکوں میں علماء کا بطور ایک منظم جماعت کے کبھی بھی زیادہ اثر نہیں رہا۔ بہرحال اب ہر اسلامی ملک میں علماء کی وہ حیثیت نہیں رہی، جو مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں صدیوں تک رہی ہے، یعنی یہ کہ وہ شریعت کے محافظ و ترجمان ہونے کی بنا پر ایک سیاسی طاقت مانے جاتے تھے اور حکمرانوں کا اُن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا تھا، اب مسلمان ملکوں میں قومی حکومتیں برسرِکار ہیں، اور اپنے جمہور سے انہیں سندِ اقتدار حاصل کرنا ہوتی ہے، نہ کہ علماء سے، کم و بیش ہر اسلامی ملک میں علماء کا سیاسی "رول" ختم ہو گیا ہے، اور جہاں اس کے کچھ آثار باقی ہیں، وہاں وہ مٹتے جا رہے ہیں، مصر میں اخوان مسلمین کے رہنماؤں کے ساتھ جو کچھ ہوا، اور انہیں جس بے دردی سے کچلا گیا، اور بعض کو پھانسیاں دی گئیں، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان ملکوں میں اس قسم کی کشمکش کتنی ہولناک شکل اختیار کر سکتی ہے، اور وہاں کی سیاسی قیادتیں دین کے نام سے ملکی و قومی معاملات میں کسی سیاسی مداخلت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں پاکستان میں ہم ان مسائل سے کس طرح نمٹیں۔ دوسرے تمام مسلمان ملکوں میں وطنی قومیت مقدم ہے، اور اسلامیت اس کے بعد آتی ہے۔ گو اُن کے ہاں وطنی قومیت اور اسلامیت اس طرح ایک دوسرے میں سموئی ہوئی ہیں کہ اُن کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جب ترک اپنے آپ کو ترک کہتا ہے، تو اس سے مراد اُس کی مسلمان ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے یہ مسلمان بھائی اپنی اپنی قومیت پر خاص زور دیتے ہیں اور اپنے مسلمان ہونے پر بھی اُن کو فخر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس پاکستان میں ہماری اسلامیت ہی ہماری قومیت کی بنیاد ہے۔ اب اگر ہمارے ہاں اسلامیت ایک وحدانی شعور نہیں، بلکہ وہ عبارت ہے مختلف فرقوں سے جو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اُن میں آپس میں برابر محاربت و مبارزت رہتی ہے، تو ذرا اندازہ کیجئے کہ ہم میں قومی وحدت کیسے پیدا ہوگی۔ اور ہم کیسے یہ محسوس کریں گے کہ ہم ایک ہیں۔ اور ہمارے دُکھ اور سُکھ مشترک ہیں۔

خوش قسمتی سے پاکستان میں سیکولر طاقتوں اور سیکولرزم کی مخالف دینی طاقتوں کے درمیان

وہ تصادم نہیں پایا جاتا، جو مثال کے طور پر ایک زمانے میں ترکی میں تھا۔ اور بعض عرب ملکوں میں اب بھی وہاں کی حکومتوں اور اخوان مسلمین میں ہے، ترکی میں آتاترک نے سیکولر نظام حکومت نافذ کر کے اُس کے مخالفوں کو سختی سے کچل دیا۔ اب بعض عرب حکومتیں سیکولرزم کو عرب اشتراکیت کے نام سے بروئے کار لا رہی ہیں اور اُن عناصر کو جو ہمارے ہاں کی بعض جماعتوں کی طرح اس کی داعی ہیں کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ کا ہے اور اُس کی "شریعت" ہی اس اقتدار کی مصدر ہونی چاہیئے، بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے میں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کا بڑا فضل ہے کہ پاکستان اس خوفناک تصادم سے بچا ہوا ہے، اور یہاں ایک طرف سیکولرزم اور دوسری طرف "شریعت" کی حاکمیت کے حامی گروہ اس انتہا پر نہیں۔

یہ صحیح، لیکن ہمارا سب سے بڑا مسئلہ خود مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کا آپس کا تصادم ہے جو برابر بڑھتا جا رہا ہے اور یہ پاکستان کی ہیئت سیاسی و اجتماعی کی وحدت و ہم آہنگی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے، بلکہ اگر زیادہ وضاحت سے کام لیا جائے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ مسلمان فرقوں کا موجودہ باہمی تصادم خود پاکستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ کیوں کہ جب اس مملکت کی اساس اسلام ہے اور اسلام اس طرح بٹا ہوا ہو، تو یہ مملکت کیسے مستحکم ہو سکے گی۔

یہاں ضرورت ان مذہبی فرقوں کو ختم کرنے کی نہیں، کیوں کہ یہ ممکن نہیں، ضرورت یہ ہے کہ وہ وسائل اور ذرائع جو ان مذہبی فرقوں کی باہمی منافرت کو ہوا دینے کا باعث ہیں، اُن کا سدِ باب کیا جائے، یہ کام بیشک مشکل ہے۔ لیکن اگر حکومت کوشش کرے تو وہ اسے کر سکتی ہے۔ اربابِ اقتدار کو اس کی طرف توجہ کرنے اور اس مسئلے کو ایک سنگین مسئلہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ اس وقت ہمارے ہاں جو مذہبی فرقہ واریت کی فضا ہے، اس کے ہوتے ہوئے پاکستان میں خواہ کتنے بھی کارخانے لگ جائیں اور تعلیم کتنی بھی پھیل جائے، ملک صحیح معنوں میں نہ مضبوط ہو گا اور نہ متحد۔ اور آج اسی کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

موجودہ مذہبی فرقہ واریت کو سب سے زیادہ تقویت اُن نام نہاد دینی مدارس سے مل رہی ہے، جنہیں ہر شخص کو قائم کرنے کی کھلی اجازت ہے اور جن کو چلانے کے لئے ان مدارس کے منتظمین کو لامحالہ فرقہ وارانہ جذبات سے اپیل کرنا پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے ان مدارس، انہیں چلانے والی انجمنوں اور ان کے ہاں سے نکلنے والے

رسالوں کا جو اکثر و بیشتر فرقہ وارانہ منافرت کے نقیب ہیں۔ معاملہ دین کا نہیں رہا، بلکہ یہ کاروبار سا بن گیا ہے، اور اس کی پشت پناہی مخلص دینی طبقوں سے زیادہ بعض مفاد پرست عناصر کرتے ہیں۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کسی مسلمان ملک میں دینی تعلیم کو اس طرح صحیح دینی مقاصد کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت نہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ صوبائی حکومت کے تحت ایک ایسا ڈائرکٹریٹ قائم ہو، جو ان مدارس کی نگرانی کرے، اور انہیں کسی ضابطے کے اندر لائے۔ مصر میں جامعہ ازہر ایک آزاد تعلیمی ادارہ ہے، اور اس کے تمام مصارف خود ازہر پر وقف شدہ جائدادوں سے آتے ہیں، لیکن اب حکومتِ مصر کی طرف سے ایک مدیر مقرر کیا گیا ہے جو اس کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا ہے۔

ہمارے ہاں ان دینی مدارس کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اور اس کا محرک دینی خدمت کا جذبہ یا دینی تعلیم پھیلانے کا اتنا شوق نہیں، جتنا کہ یہ ایک روزگار کا ذریعہ ہے اسی کی وجہ سے مذہبی فرقہ واریت پھیل رہی ہے۔

بے شک ایک مسلمان معاشرہ میں علمائے کرام کا اپنا مقام ہے لیکن ہمارے ہاں یہ جو تصور ہے کہ قرآن و سنت کے معانی و مقاصد کو بیان کرنے کے علاوہ علما کی طرف سے سیاسی امور کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی دینی حیثیت بھی وہی ہے، جو ان کی قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کی ہے، یہ انتہائی خطرناک مسئلہ ہے، اور بعض مسلمان ملکوں میں انتہائی قسم کی جو سیکولرزم آئی ہے وہ اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں ایک دینی جماعت نے برسوں تک یہ دعوت دی کہ ڈیموکریسی اسلام کے خلاف ہے اور اس کے ثبوت میں قرآن و سنت سے شواہد دیئے، اب وہی جماعت ڈیموکریسی کو عین اسلام قرار دیتی ہے۔ اور ڈیموکریسی بھی ایک خاص طرز کی۔ اسی طرح ایک زمانے میں اس کے ہاں کسی کی ذاتی ملکیت میں کوئی تحدید کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین سے انحراف تھا۔ اور اب وہ اس پر خاموش ہے۔ ایسے ہی بہت سے اور وقتی سیاسی مسائل ہیں جن کے خلاف یا حمایت میں اس نے قرآن و سنت کو پیش کیا اور ہر وقتی سیاسی مسئلے کو دین کا اصل مسئلہ بنا کر عوام میں اس کی تشہیر کی۔

دین کو سیاسی ایجی ٹیشن کا ذریعہ بنانے کی آج کل ہر مسلمان ملک میں ممانعت ہے، بے شک علما کو حق حاصل ہے کہ وہ ہر مسئلے کے بارے میں اپنی صوابدید کے مطابق رائے دیں، لیکن علما کا دینی تنظیم کے نام سے سیاست گری کرنا اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ مانا کہ اسلام میں دین اور سیاست میں تفریق نہیں، لیکن یہاں تو یہ حال ہے کہ علما دین میں بھی اپنی اجارہ داری چاہتے ہیں اور ہر سیاسی مسئلہ کو بھی وہ دینی بنا کر اسے اپنے سے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح دین

اور سیاست دونوں کے وہ بلا شرکت غیرے مالک بن جاتے ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح ہونی چاہیئے اور وہ اس طرح کہ دینی جماعتوں کو حزبی سیاسیات میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہو اور اُن کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ یا وہ خالصاً دینی کام کریں، یا دین کا لبادہ اُتار کر کھلے بندوں سیاسیات میں آئیں۔

پاکستان کی صحت مند سیاسیات اور متوازن ترقی کے لئے یہ بے حد ضروری ہے، خدانخواستہ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو عوام کی تمام صلاحیتیں انہی بحثوں کی نذر ہو جائیں گی کہ جداگانہ انتخاب اسلام ہے یا نہیں۔ اقتدارِ اعلیٰ کس کا ہے؟

ترکی، ایران، مصر اور دوسرے مسلمان ملکوں کے اور مسائل تھے اور وہاں کی قیادتوں کو اپنے حالات کے مطابق اُن سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ انقلابِ اکتوبر نے اُن تمام مسائل کو جنہیں پہلے کی متذبذب قیادتیں ٹالتی چلی آتی تھیں، بڑی جرأت سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ جرأت مند قیادت ایک فوجی قیادت ہی ہو سکتی ہے، ترکی میں یہ کام اتاترک اور اُن کے ساتھیوں نے کیا۔ ایران میں رضا شاہ مرحوم نے اس کی ہمت کی، مصر میں ایک فوجی قیادت ہی موجودہ اقدامات کر رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ مسلمان عوام میں صدیوں کے سیاسی و معاشی نظام اور خاص مذہبی فضا نے از خود اُٹھ کر کسی نئے اصلاحی قدم اُٹھانے کی صلاحیت ہی نہیں رہنے دی، باقی رہے علماً، اُن میں سے اکثر تو فرقہ واریت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور جو جال سے باہر ہیں، وہ عوام کے ہر طرف پیچھے دیکھنے کے رجحان سے فائدہ اُٹھانے اور اس طرح سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان حالات میں معاشرتی اصلاح کیسے ہو گی۔

ان سالوں میں مسلمان ملکوں کی فوجی قیادتوں نے اپنے ہاں کے باشعور لیکن مختصر طبقے کی مدد سے وہ سب کچھ کیا۔ جسے اگر وہ نہ کرتیں، تو یہ ملک کبھی بھی اُن دلدلوں سے نہ نکل پاتے، جن میں عثمانیوں اور خدیوؤں وغیرہ نے اُنہیں پھنسا رکھا تھا۔

زرعی و صنعتی ترقی اور فوجی مضبوطی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی موجودہ قیادت کو مذہبی فرقہ داریت اور مذہب کو سیاست کا آلہ کار بنانے کی سرگرمیوں کو بھی روکنا چاہیئے، کیوں کہ اس کے روکے بغیر اوّل الذکر کوششیں کبھی پوری طرح بار آور نہیں ہو سکیں گی۔